مولانا سعید الرحمٰن ندوی
ناظم، فرقان اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور، انڈیا

قرآن عظیم اور کائناتی زمینیں

زمینوں کی ایک خوفناک طبعی حقیقت

یہ مقالہ مضمون نگار کی غیر مطبوعہ تصنیف ''قرآن عظیم کی آفاقیت اور اس کا فلسفہ کائنات: خارج از زمین زندگی، انسان کی حقیقت اور خود اپنی اصلیت پر جدید اعجازی قرآنی بصائر'' کا تیسرا باب ہے۔ اس کے پہلے دو ابواب چار قسطوں میں ''الحق'' کے جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء اور فروری ۲۰۰۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

ساتوں آسمانوں میں موجود ساری ہی زمینوں کے تعلق سے، جس میں خود ہماری زمین بھی بنفس نفیس شامل ہے، قرآن حکیم منصوص طور پر ایک حیرت انگیز طبعی و تکوینی حقیقت کا اعلان اس طرح کرتا ہے:

۱۔ ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ، وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ (بقرۃ:۱۶۴)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں، دن اور رات کے اختلاف میں، ان جہازوں میں جو لوگوں کی نفع بخش اشیاء لے کر چلتے ہیں، اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسا کر زمینوں کو ان کی موت کے بعد زندہ کر کے ان میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دیے، ہواؤں کے بدلنے میں اور آسمانوں اور زمینوں کے درمیان مسخر بادل میں عقل مندوں کے لئے بہت ساری نشانیاں ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ﴿السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ﴾ کی ترکیب سے متشرح ہو رہا ہے کہ یہاں بھی ﴿الْأَرْضُ﴾ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس سے اس کائنات کی ساری ہی زمینیں مراد ہیں۔ نیز یہاں لفظ ﴿السَّمَآءُ﴾ بھی اسم جنس ہی واقع ہو رہا ہے، کیوں کہ وہ خود بھی اسم جنس ہے، اور ﴿السَّمٰوٰتُ﴾ کے سیاق میں بھی استعمال ہو رہا ہے، جس سے ساتوں آسمان مراد ہیں۔ لہٰذا یہاں باری تعالیٰ کے جملہ چھ دلائل ربوبیت مذکور ہیں، جو سب کے سب واؤ عاطفہ کے ذریعے آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چوتھی ربانی دلیل

﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ (اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسا کر زمینوں کو ان کی موت کے بعد زندہ کر کے ان میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دئے) ہے۔

وقتاً فوقتاً آسمان سے پانی برسا کر ہماری زمین کے کسی خشک و بنجر حصے کو زندہ کرتے رہنے کا بیان قرآن حکیم میں بصیغہء مضارع متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مگر موجودہ آیت کریمہ میں یہ بیان اولاً بصیغہء ماضی آیا ہے، پھر اس کے بعد تعبیر میں اعجازی تبدیلی لاتے ہوئے اس عمل کے نتیجے میں مرتب ہونے والے ایک اور فعل الٰہی ﴿وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ (اور ان میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دئے) کا معنی خیز اضافہ کر دیا گیا ہے، اور اس پر مستزاد ﴿الْاَرْضُ﴾ کے بطور اسم جنس استعمال کی حقیقت بھی۔ لہٰذا ان تمام دلائل و شواہد سے بخوبی مستنبط ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہمارے روز مرہ کے عام مشاہدے میں آنے والا باری تعالیٰ کا وہ عمل نہیں ہے جس کے ذریعے آسمان سے پانی برسا کر جزوی طور پر صرف ہماری موجودہ زمین کے کسی بنجر علاقے کو سرسبز و شاداب کیا جاتا ہے، بلکہ واقعتاً اس سے مقصود انسان کو اس حقیقت عظمیٰ سے مطلع کرنا ہے کہ ہماری زمین کے بشمول عمومی طور کائنات کی دیگر ساری زمینیں بھی سابق میں مردہ تھیں، جنہیں ماضی ہی میں کبھی آسمانوں سے پانی برسا کر زندگی عطا کئے جانے کے بعد ان میں ہر طرح کے جاندار بسائے اور پھیلائے گئے تھے!

چنانچہ قرآن عظیم نے باتوں ہی باتوں میں اور ایک نہایت ہی صاف سیدھی تعبیر کے ذریعے عالم طبیعیات اور عالم ارضیات کے ایک ایسے راز سے پردہ اٹھا دیا ہے جس کی کنہ تک اب تک دنیائے سائنس کو بھی خاطر خواہ رسائی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ جب کہ صرف ہماری موجودہ زمین پر ٹھوس علمی و سائنسی شہادتوں کی بنیاد پر قیاس آرائیاں ضرور ہو رہی ہیں کہ ساڑھے چھ کروڑ سال قبل یہ جس طرح ایک طبیعی حادثے کے نتیجے میں بنجر (مردہ) ہو کر اس کی سطح سے ڈائنوزار (dinosaur) اور تقریباً ساری ہی نباتاتی اور حیواناتی انواع ناپید ہو گئی تھیں کیا اُسے عمومی طور پر بانجھ کر دینے والے اس طرح کے حادثات (earth sterilizing events) اس کی طبقاتی تاریخ (geological past) میں اور بھی پیش آ چکے ہیں، جن کی وجہ سے یہاں کا حیاتیاتی دور (life cycle) کلی طور پر معدوم ہو کر ایک سے زائد مرتبہ از سر نو شروع ہو چکا ہو؟ مگر قرآن حکیم یہاں پوری وضاحت کیساتھ یہ اعلان کر رہا ہے کہ نہ صرف ہماری ایک زمین بلکہ دیگر تمام آسمانی زمینیں بھی اپنے اپنے موجودہ حیاتیاتی ادوار سے قبل مردہ ہی تھیں، جنہیں آسمانوں سے بارش کے پانی کے ذریعے سیراب کر کے زندہ کرنے کے بعد ہی ان میں ہر طرح کے جاندار بسائے اور پھیلائے گئے تھے۔ لہٰذا اس کا بہت ہی واضح اور دوررس مطلب یہ ہوا کہ ہماری زمین کے کل مظاہر حیات اور خصوصاً ہمارا موجودہ سلسلۂ انسانیت بھی اسکے حالیہ حیاتیاتی دور ہی کے مرہون منت ہیں، کیونکہ پچھلے باب کی تحقیق کے مطابق یہاں بھی بسائے اور پھیلائے گئے

﴿دَآبَّةٍ﴾ کے مفہوم میں انسان بھی شامل ہے، اور یہ کہ موجودہ سلسلۂ انسانیت کی پچھلی چند ہزار سالہ تاریخ کے دوران یا ماضی قریب ہی میں سہی یہ کبھی عمومی طور پر مردہ اور بنجر بھی نہیں ہوئی ہے۔

اب اس نئی حقیقت کے انکشاف سے ذہنوں میں ایک بالکل ہی بنیادی اور ناگزیر سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ جب زمینیں اپنے اپنے موجودہ زندہ ادوار سے قبل مردہ تھیں تو وہ اپنی اُن اموات سے قبل کیا تھیں، کیوں کہ موت کا اطلاق صرف انہیں پر ہوسکتا ہے جو کبھی زندہ رہے ہوں، بے جان کو کسی بھی قیمت پر مردہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اور الفاظ قرآنی ﴿بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (ان کی موت کے بعد) سے بھی بالکل عیاں ہے کہ سابق میں ان زمینوں کو موت حالت حیات ہی میں لاحق ہوئی تھی۔ اس طرح اس نقطۂ نظر سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اپنی اپنی سابقہ اموات سے قبل زمینوں پر حیاتی وزندگانی کا ایک اور دور بھی گزر چکا ہے! اور اگر اس منطق کو اور پیچھے کی جانب لوٹایا جائے تو اس سے اس ہماری زمین کی اور دیگر ساری ہی آسمانی زمینوں کی بھی متعدد مزید اموات وحیات ثابت ہوجاتی ہیں!! لہٰذا جب ان زمینوں کے حالیہ زندہ ادوار میں ہر طرح کی مخلوقات کو بسایا اور پھیلایا گیا ہے تو اس سے یہ بھی خود بخود مستنبط ہوتا ہے کہ ٹھیک انہیں کے نقش قدم پر تخلیق وآفرینش کا یہ سلسلہ ان کے سابقہ زندہ ادوار میں بھی وقفے وقفے سے پورے آب وتاب کے ساتھ جاری وساری رہ کر خود ان زمینوں کی اپنی اپنی اموات کے ساتھ نیست ونابود ہوتا رہا ہے۔ حسب ذیل آیات ٹھیک یہی سبق ایک دیگر پیرایے میں اس طرح دینے والی ہیں:

۲- ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ، إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ. قُلْ سِيرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ...﴾ (عنکبوت:۱۹-۲۰)

ترجمہ: کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح آفرینش کی ابتدا کرتا ہے، پھر (یعنی ایک مدت بعد) اسے (یعنی ابتدائے آفرینش کو) دہراتا بھی ہے؟ یقیناً یہ اللہ کے لئے آسان ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اس نے آفرینش کی ابتدا کس طرح کی ہے۔

یہاں ﴿الْخَلْقُ﴾ "خَلَقَ، يَخْلُقُ" کا مصدر ہے، جس کے معنے "پیشگی نمونے کے بغیر ہی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لے آنا" ہوتے ہیں۔ نیز یہ لفظ یکساں طور پر مخلوق یا صرف انسان کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ باعتبار لغت یہ تینوں معانی کافی مشہور ومتداول ہیں۔ خود قرآن مجید میں بھی اس لفظ کا استعمال ان تینوں معانی میں بکثرت ہوا ہے، جس کی بالترتیب امثال ونظائر حسب ذیل ہیں:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ...﴾ (شوریٰ:۲۹)

ترجمہ: اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق ہے۔

﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَأَرُوْنِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ...﴾ (لقمان:۱۱)

ترجمہ: یہ ہوئی اللہ کی مخلوق، اب مجھے دکھاؤ کہ اس کے علاوہ دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟

﴿إِنَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ...﴾ (یونس:۴)

ترجمہ: بے شک وہی انسان (کی تخلیق) کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ بھی کرتا ہے، تاکہ ایمان لے آنے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔

چنانچہ یہاں یہ تینوں معانی بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیوں کہ ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دو معانی آپس میں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہی ہیں، کیوں کہ آفرینش ہی سے مخلوق وجود میں آتی ہے۔ اِدھر تخلیق کا عمل شروع ہوا کہ اُدھر منصۂ وجود پر مخلوقات کی بھی ابتدا ہوگئی۔ اور ان دونوں معانی کے تعلق سے اس تیسرے معنے کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، جس پر مفصل گفتگو انشاء اللہ العزیز اپنے اگلے مضمون میں کی جائے گی۔ البتہ اس وقت ہم یہاں صرف پہلے معنے اخذ کرنے ہی پر اکتفاء کریں گے۔ اسی طرح حقیقی طور پر اور لغت کے اعتبار سے "بَدَأَ"، "أَبْدَأَ" اور "ابْتَدَأَ" آپس میں ایک دوسرے کے مترادفات ہیں، جن کے معنے کسی کام کی شروعات کرنا ہوتے ہیں، اور یہاں وہی مراد بھی ہیں، جیسا کے ایک دوسرے موقع سے ارشاد باری ہے:

﴿...وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ﴾ (سجدہ:۷)

ترجمہ: اس نے خلقت انسانی کی شروعات مٹی سے کی۔

نیز قرآنی تعبیر سے بالکل عیاں ہے کہ ﴿يُعِيْدُهُ﴾ (وہ اسے دہراتا ہے) میں موجود ضمیر متصل "ہٗ" سے اشارہ ابتدائے آفرینش ہی کی جانب ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کے حقیقی معانی اور اس ضمیر کے حقیقی مرجع کی حقیقت دونوں سے مستنبط ہوتا ہے کہ زیر بحث آیات کریمہ میں ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ﴾ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح آفرینش کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دہراتا بھی ہے؟) کے ذریعے انسان کو ابتدائے آفرینش اور اس کے پھر سے اعادے یعنی خلقت کے بار بار از سر نو دہرائے جانے کے عمومی عمل میں غور وفکر کی دعوت پیش کی جارہی ہے۔ لہٰذا اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ یہاں بیان قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے کا نہیں ہو رہا ہے، کیوں کہ اس دن تخلیقی عمل کی ابتدا کو از سر نو ایک اور مرتبہ دہرایا نہیں جاتا ہے، بلکہ مردوں کو ان کی خبروں سے آناً فاناً نکالا جاتا ہے، جیسا کہ حسب ذیل ارشادات باری سے واضح ہے:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ﴾ (یٰس:۵۱)

ترجمہ: صور پھونکا جائے گا تو وہ فوراً قبروں سے اپنے رب کی طرف دوڑے چلے آئیں گے۔

﴿إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ﴾ (یٰس:۵۳)

ترجمہ: وہ تو صرف ایک آواز ہوگی، پھر وہ سب دفعتہً ہمارے حضور میں پیش کئے جائیں گے۔

لہذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں بیان معنی خیز طور پر پچھلے ارشاد باری کے ذریعے ثابت شدہ کائنات کی ساری ہی زمینوں کے متعدد زندہ و مردہ ادوار اور تسلسل کے ساتھ ان کے ہر زندہ دور میں عمل تخلیق کی از سر نو ابتدا کئے جاتے رہنے ہی کا ہو رہا ہے۔ اسی لئے اس سے متصل اگلی آیت میں ﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اس نے آفرینش کی ابتدا کس طرح کی ہے) کے ذریعے اسے خود اپنی زمین پر رواں تخلیق کی شروعات کیسے ہوئی ہے اس میں بھی تفکر و تدبر پر ابھارا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ فقرہ منصوص طور پر ناطق ہے کہ ہماری زمین پر زندگی کا جو وجود ہے اور یہاں جو بھی انواع حیات موجود ہیں وہ سب کی سب اچانک اور یک بارگی ظہور پزیر نہیں ہوئیں، بلکہ ان سب کا ایک نقطۂ آغاز بھی رہا ہے۔ اس وقت یہ احتمال ضرور موجود ہے کہ اس ارشاد ربانی کے ذریعے غور فکر کی جو دعوت دی جا رہی ہے وہ اس عالم مادی کی طبیعی تخلیق میں ہو، مگر یہ آخر الذکر آیت اس امکان کو حتمی طور پر خارج کرنے والی ہے، کیوں کہ زمین پر چلنے پھرنے سے یعنی اس کی داخلی شہادتوں سے جو علم حاصل ہوگا وہ مطالعۂ حیاتیات اور اس کے نقطۂ آغاز تک نفوذ حاصل کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے، برعکس طبیعیات کے، جس کے لئے عموماً سارا انحصار خارجی شواہد ہی پر ہوتا ہے۔

چنانچہ اس دعوت الٰہی سے پوری وضاحت کے ساتھ مستنبط ہوتا ہے کہ انسان اپنے طور پر اس عظیم طبیعی و آفاقی حقیقت کا صحیح صحیح ادراک بھی کر سکتا ہے، ورنہ اسے اس پر کبھی ابھارا ہی نہ جاتا۔ ملحوظ رہے کہ یہاں خلقت کے بار بار از سر نو دہرائے جانے کے عمل میں غور و فکر کے لئے بھی ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا﴾ ہی کے ذریعے دعوت دی جا رہی ہے، جب کہ آج وہ عمل کسی بھی طرح ہماری رویت عینی و نظری میں نہیں ہے۔ لہذا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں دعوت رویت علمی و استدلالی ہی کی دی جا رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اپنے سابقہ ''قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات'' والے مضمون میں طبق در طبق قائم ساتوں آسمانوں اور ان کی موجودات کی رویت کو بھی ٹھیک اسی پر محمول کیا تھا۔ لہذا آج انسان اس عدیم المثال خدائی دعوت پر معنوی انداز میں لبیک کہہ کر اور اس پر اپنی مہر تصدیق پوری طرح سے ثبت کرتے ہوئے تجرباتی و مشاہداتی میدان میں کم از کم ہمارے نظام شمسی کے بعض زمینی سیاروں پر ممکنہ تخلیق و تخریب کے عوامل پر روز بروز کافی وقیع علمی و عقلی دلائل و براہین بھی قائم کرتا جا رہا ہے، اور خود ہماری موجودہ زمین کے ضمن میں بھی یہ بحث کافی ترقی کر چکی ہے، جس پر تفصیلی گفتگو ابھی آگے آ رہی ہے۔

اس طرح موجودہ بیان پچھلے بیان کے ذریعے ثابت شدہ ساری زمینوں کی سابقہ اموات کی حقیقت کو مزید موکد کرتے ہوئے اُس سے بھی قبل ان پر تسلسل کے ساتھ وقفے وقفے سے جاری رہے موت و حیات کے مختلف ادوار کی حقیقت کو منکشف کرنے والا ہو جاتا ہے۔ لہذا جب ہماری موجودہ زمین سمیت ہر کائناتی زمین پر بھی اس کے اپنے حالیہ زندہ دور ہی کے مانند متعدد مزید ادوار سابق میں بھی گزر چکے ہیں اور ہر مرتبہ ان میں حیاتیات کا عمل از سر نو شروع

کر کے ختم بھی کیا جا چکا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سابقہ پیدائشوں کا خدائی مقصد کیا تھا؟ کیا اُس وقت بھی موجودہ انسانی و جناتی نسلوں ہی کی طرح کوئی اور مکلف مخلوقات ان میں بسائی گئی تھیں؟ چنانچہ خود موجودہ قرآنی بیان کی شرح وتفسیر اور مزید روشنی کے لئے حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سوال کا جواب یہاں بھی ٹھیک اسی قسم کی تعبیر کا استعمال کرتے ہوئے صرف ہماری موجودہ زمین کے پس منظر میں دیا جا رہا ہے، جس پر دیگر زمینوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے:

۳- ﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ، كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ، فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ. ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ. اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (روم:۹-۱۱)

ترجمہ: کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان سے قبل والوں کا انجام کیسا رہا تھا؟ وہ قوت میں ان سے بھی زیادہ بڑھے ہوئے تھے، انہوں نے زمین کو جوتا تھا، اسے ان سے بھی زیادہ آباد کیا تھا، اور ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں بھی لے آئے تھے، سو اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا، بلکہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے خود وہی تھے۔ پھر برا کرنے والوں کا انجام بھی برا ہی ہوا، کیوں کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اللہ ہی آفرینش کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دہراتا بھی ہے، پھر تمہیں اسی کے پاس لوٹایا بھی جائے گا۔

اگر سابقہ ارشاد میں باری تعالیٰ کی جانب سے تخلیق کے از سر نو بار بار دہرائے جانے کی اخبر دے کر ﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ﴾ کے ذریعے ہماری زمین پر صرف رواں تخلیق کی ابتدا پر غور فکر کی دعوت دی تھی تو اب موجودہ ارشاد میں ٹھیک اسی طرح کی تعبیر ﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾ کے ذریعے اس پر گزرے سابقہ تخلیقی ادوار میں بھی بسائی گئی مخلوقات کے سوء انجام کے مشاہدے پر ابھارا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس مفہوم کو مزید مضبوط و مستحکم کرنے ہی کی خاطر آخر میں ایک اور مرتبہ ﴿اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾ کا اعادہ بھی کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تسلسل کے ساتھ آفرینش و مخلوقات کی ابتدا کرتا اور اسے دہراتا بھی رہتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ فقرہ اگر سابقہ ارشاد کی بالکل ابتدا میں بیان کیا گیا تھا تو یہاں تعبیر کی تبدیلی کے ذریعے بالکل آخر میں واقع ہو رہا ہے۔ چنانچہ ان دونوں بیانات کے درمیان تعبیر کا یہ اتحاد ان کے معنوی اتحاد کا بھی فائدہ دیتا ہے۔

لہٰذا اس ربانی ارشاد کے مطابق زمین کی سابقہ مخلوقات وہ ہوئیں جو زمین جوتنے والی اور قوت طاقت اور عددی کثرت میں بھی ہم سے بہت فائق و برتر تھیں۔ نیز ان کے درمیان ربانی نشانیوں کے ساتھ انبیاء و مرسلین بھی

مبعوث کئے گئے تھے، جن کی تکذیب ہی کی بنیاد پر انہیں نیست ونابود کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ زمینوں پر زندہ اور مردہ ادوار کا ورود وذہاب ان میں مکلف مخلوقات کی بالترتیب تخلیق وتعذیب ہی کے لئے ہوتا ہے۔ مزید برآں اس موقع سے دعوت الٰہی ﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ...﴾ سے ایک اور مرتبہ مستنبط ہوتا ہے کہ موجودہ انسان جس طرح زمین پر رواں تخلیقی دور اور اس کے آغاز پر علمی دلیل قائم کرسکتا ہے ٹھیک اسی کے موافق اس پر گزرے اسی طرح کے سابقہ ادوار اور ان میں بسائی گئی مخلوقات کے انجام کو بھی اپنے احاطۂ علمی میں لاسکتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں بیانات کی مزید تاکید اور افزوں روشنی کے لئے حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

۴- ﴿أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ. وَإِنْ كُلٌّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ. وَآيَةٌ لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ، أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ﴾ (یس:۳۱-۳۳)

ترجمہ: کیا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے ان سے قبل کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کردیا ہے، جو خود اپنی ہی جانب لوٹ کر نہیں آتی ہیں؟ اور ان میں سے ایسی کوئی بھی نہیں جو مجموعی طور پر ہمارے آگے حاضر نہ کی جائے۔ اور ان کی (ہلاکت کی) ایک بڑی علامت مردہ زمین ہے، جسے ہم نے زندہ کر کے اس سے اناج نکالا ہے، جس سے وہ کھاتے ہیں۔

ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں کتنی صراحت کے ساتھ سابقہ نسلوں کی تباہی کی ایک بڑی اور واضح علامت زمین کی مردہ حالتیں قرار دی جارہی ہیں، جس سے ہم اس کی کسی مزید توجیہ سے مستغنی ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس سے سابق میں ہماری زمین کی صرف ایک زندگی اور ایک موت نہیں بلکہ متعدد زندگیاں اور متعدد اموات ثابت ہورہی ہیں، جس سے اوپر ہماری جانب سے زمینوں کے کثرت اموات وحیات کا اخذ کردہ مفہوم اور زیادہ مضبوط ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس کا صریح مطلب یہ ہوا کہ ان سابقہ نسلوں کا تعلق زمین کے سابقہ حیاتیاتی ادوار ہی سے ہے، جنہیں یکے بعد دیگرے اس کی ہر موت کے ساتھ ہلاک وبرباد کردیا گیا تھا۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ہم نے اپنے ایک اور سابقہ مضمون ''قرآن عظیم اور کائناتی مخلوق'' میں کائناتی تناظر میں ﴿قَرْنٌ﴾ سے جس طرح ایک زمین کی پوری مخلوق مراد لی تھی یہاں اس فلسفے میں مزید نکھار پیدا کرتے ہوئے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب یہ اصطلاح ایک ہی زمین کے مختلف زندہ ادوار کے پس منظر میں استعمال کی جائے تو اس سے اس کے کسی بھی ایک زندہ دور کی پوری ہی سلسلۂ مخلوق مراد ہوجاتی ہے۔ موجودہ بیان بھی اسی نوع سے تعلق رکھنے والا ہے۔ چنانچہ ﴿قَرْنٌ﴾ سے مراد لئے گئے ہمارے اس مفہوم اور خود موجودہ بیان کی مزید تائید وتقویت کے لئے حسب ذیل دو مزید بیانات بھی ملاحظہ ہوں:

۵- ﴿أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ، إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِأُولِي النُّهَىٰ. وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُسَمًّى﴾ (طٰہٰ:۱۲۸-۱۲۹)

ترجمہ: کیا انہیں اس امر سے سبق حاصل نہیں ہوا کہ ہم نے ان سے قبل کئی نسلیں ہلاک کردی ہیں، جن کے مسکنوں میں (اب) یہ چل پھر رہے ہیں؟ بے شک اس میں عقل مندوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ اور اگر آپ کے رب کی جانب سے ایک بات اور ایک معین میعاد پہلے ہی سے طے نہ ہوتے تو عذاب (ان پر بھی) لازمی طور پر آ ہی گیا ہوتا۔

یہاں ﴿لَهُمْ﴾ سے اشارہ موجودہ منکرین کی جانب ہے، جس کے ذریعے اس طبقے سے عمومی طور پر بصیغہ غائب خطاب کیا جارہا ہے۔ اسی طرح اس قرآنی تعبیر سے ظاہر ہے کہ ﴿يَمْشُونَ﴾ میں موجود ضمیر جمع ﴿لَهُمْ﴾ میں موجود ضمیر جمع کی جانب لوٹ رہی ہے۔ نیز یہاں وعید کے پیش نظر ہی موجودہ نسل انسانی کا صرف منکر طبقہ مخاطب ہے۔ ورنہ اس میں مومنین بھی داخل ہیں، کیوں کہ سابقہ نسلوں کے مسکنوں میں چل پھرنے والوں میں وہ بھی بنفس نفیس شامل ہیں۔ چنانچہ اس عمومی تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سابقہ نسلیں جن کے مسکنوں میں اب ہم چل پھر رہے ہیں وہ اس سر زمین پر اس کے سابقہ زندہ ادوار میں بسا کر ہلاک کی گئی مخلوقات ہی ہیں۔ اسی لئے اگلی آیت میں خود ہمیں بھی یہ وعید پیش کی جارہی ہے کہ اگر ہماری بھی ہلاکت کا ایک وقت متعین نہ ہوتا تو ان سابقین کے نقش قدم پر اب تک ہمیں بھی کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا ہوتا۔

۶- ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا، كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ. ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴾ (یونس:۱۳-۱۴) ترجمہ: یقیناً ہم تم سے قبل بہت ساری نسلوں کو جب وہ ظالم بنے ہلاک کر چکے ہیں، حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر وہ ایمان لے آنے والے نہیں تھے۔ ہم مجرموں کا بدلہ اسی طرح دیا کرتے ہیں۔ پھر (ایک مدت بعد) ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا، تاکہ دیکھیں تم کس طرح کا عمل کرتے ہو۔

ان آیات میں ﴿قَبْلِكُمْ﴾ اور ﴿جَعَلْنَاكُمْ﴾ سے بالکل عیاں ہے کہ پچھلے ارشاد ہی کی طرح یہاں بھی خطاب کی نوعیت عمومی ہی ہے۔ چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں موجودہ نسل انسانی کو زمین کے رواں زندہ دور میں سابقہ نسلوں کے مسکنوں میں چلنے پھرنے والی بنائے جانے کا مزید کیا مطلب ہوسکتا ہے اس کی توجیہ یہاں اس طرح کی جارہی ہے کہ ان سابقہ نسلوں کو ہلاک کردئے جانے کے ایک عرصہ بعد ہی اسے اس میں ان کا خلیفہ بنا کر آزمایا جارہا ہے۔ ملحوظ رہے کہ ﴿ثُمَّ﴾ ترتیب کے ساتھ تراخی یعنی دو افعال کے درمیان زمانے کی دوری کا بھی فائدہ دیتا ہے۔ چنانچہ آئندہ مباحث سے ثابت ہوگا ایک زمین کی دو الگ الگ نسلوں یا بالفاظ دیگر اس کی دو الگ الگ زندگیوں کے درمیان نہایت طویل زمانی فاصلہ بھی ہوتا ہے۔ جدید فلکیات کی رو سے بھی اس مظہر ربوبیت پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس طرح موجودہ بیان پچھلے بیان کی تفسیر و توجیہ کرنے والا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب دو مزید ارشادات بھی ملاحظہ ہوں جو ان سابقہ زمینی مخلوقات کی حقیقت کو الگ الگ پیرایوں میں اور زیادہ قوت و استحکام پہنچانے والے ہیں:

۷- ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (بقرۃ:۲۱)

ترجمہ: اے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور انہیں بھی جو تم سے قبل رہ چکے ہیں، تاکہ تم پرہیزگار بن سکو۔

قرآن مجید کی اولین سورت بقرہ کے ابتدائی دو رکوعات میں موجودہ انسان کی مومن، کافر اور منافق کی سہ گانہ تقسیم کے بعد اب تیسرے رکوع کی موجودہ پہلی آیت میں پہلی مرتبہ نوع انسانی سے عمومی طور پر مخاطب ہو کر اسے اپنے رب کی عبادت پر ابھارا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس موقع سے ﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تم سے قبل رہ چکے ہیں) کے ذریعے یہ معنی خیز اشارہ کیا جا رہا ہے کہ بلاشرکت غیرے صرف تم ہی اکیلے اس زمین پر پیدا نہیں کئے گئے ہو، بلکہ تم سے قبل یہاں اور بھی مخلوقات کو خلعت وجود سے نوازا جا چکا ہے۔

۸- ﴿اَوَلَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ.﴾ (اعراف:۱۰۰)

ترجمہ: کیا ان لوگوں کو واضح نہیں ہوا جو زمین کے باشندوں کے بعد اس کے وارث بنے ہیں کہ ہم اگر چاہتے تو انہیں بھی ان کے گناہوں کے عوض میں پکڑ لیتے۔

قرآنی تعبیرات ﴿الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ﴾ (جو زمین کے وارث بنے ہیں) اور ﴿مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ﴾ (اس کے باشندوں کے بعد) سے بالکل واضح ہے کہ یہاں خطاب عمومی طور پر ساری انسانیت کے پس منظر میں ہو رہا ہے۔ چنانچہ زمین کے سابقہ سارے باشندوں کو ان کے گناہوں کے عوض ہلاک کئے جانے کے بعد موجودہ انسان کو اس کا وارث اور خلیفہ بنائے جانے کے بیان سے بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ وہ قدیم باشندے سابقہ زمینی مخلوقات ہی ہیں۔ چنانچہ یہاں ﴿مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ﴾ (زمین کے سابقہ باشندے) اور پچھلے ارشاد میں ﴿وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (جو تم سے قبل رہ چکے ہیں) باہم ایک دوسرے کی بحسن وخوبی شرح وتفسیر کرنے والے ہیں۔

اس طرح یہ ساری آیات اس زمین پر وقفے وقفے سے بسا کر ہلاک کی گئی سابقہ مخلوقات کے خدوخال واضح کرنے والی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے معنی خیز طور پر ان مخلوقات کی تعیین وتشخیص صراحت کے ساتھ اور براہ راست کسی مخصوص نام سے نہ کرتے ہوئے اس ضمن میں صرف بلیغ اشارات ہی پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ جب ہمارے پچھلے مضامین سے مختلف پیرایوں میں اور نہایت مدلل طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ جن وانس کی تخلیق ساتوں آسمانوں میں ابتلا وآزمائش ہی کی خاطر کی گئی ہے اور یہ کہ قرآن مجید میں کہیں بھی ان کے علاوہ کوئی اور مخلوق مذکور نہیں ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کلیے کو ہماری زمین کے ہر زندہ دور اور اس میں بسائی گئی مخلوقات پر بھی بحسن وخوبی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں اوپر سورۂ یٰس، طٰہٰ اور یونس والے تینوں بیانات کے مطابق خود موجودہ نسل انسانی بھی زمین کی سابقہ نسلوں کے مانند صرف ایک اور نسل ہی ہے۔ اور یہی وجہ بھی ہے کہ کتاب الٰہی اس ضمن میں پراسرار خاموشی اختیار

کئے ہوئے نظر آرہی ہے۔ چنانچہ فی الحال ہم صرف ان مضبوط بنیادوں ہی پر تکیہ کرتے ہوئے اور خود قارئین کرام سے رخصت چاہتے ہوئے ان ساری ماقبل مخلوقات کو بھی راست طور پر جن وانس ہی سے موسوم کردے رہے ہیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ ہمارے اگلے مباحث سے بخوبی ثابت ہوگا کہ ان کی یہ عارضی اجازت کسی بھی طرح رائگاں نہیں گئی۔ چنانچہ جب ہماری صرف ایک زمین کے مختلف زندہ ادوار میں اس قدر انسانی وجناتی نسلوں کو وقفے وقفے سے بطور امتحان وآزمائش بسا کر ہلاک کیا جانا ثابت ہورہا ہے تو اس پر دیگر ساری آسمانی زمینوں کے ثابت شدہ بے شمار زندہ ادوار کو بھی بخوبی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اب منطقی طور پر ذہنوں میں ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ زمینوں کی موت وحیات کیا چیز ہوتی ہے جو اس قدر معنی خیز اور انقلابی تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہو؟ چنانچہ اس کے لئے بھی ہم اپنی موجودہ زمین کی موت وحیات کا جائزہ لیتے ہوئے اس مظہر ربوبیت کو دیگر زمینوں کے پس منظر میں بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ اوپر سورۂ بقرہ والے بیان کے مطابق جب ہماری زمین بشمول دیگر ساری زمینوں کو ان کی حالت موت میں آسمان سے پانی برسا کر زندہ کیا گیا تھا تو اس کا منطقی ولازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اِن کی اُن مردہ حالتوں میں ہر جگہ پانی کا فقدان تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اپنی سابقہ اموات سے قبل زمینیں جب زندہ تھیں تو اس وقت ان میں پانی ضرور موجود تھا، جو بعد میں ان کی اموات کے ساتھ ہی معدوم کردیا گیا ہو۔ یعنی زمینیں جب زندہ ہوتی ہیں تو ان میں پانی موجود رہتا ہے، اور جب وہ مردہ ہوجاتی ہیں تو وہ بھی وہاں سے ختم ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید ایک اور مقام پر نہایت ہی صراحت کے ساتھ یہ عمومی اعلان کرتا ہے کہ ساتوں آسمانوں میں موجود ساری ہی انواع حیات کو بھی پانی ہی سے پیدا کیا گیا ہے:

۹- ﴿أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا، وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ...﴾ (انبیاء:۳۰)

ترجمہ: کیا کفار نے نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمینیں آپس میں جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا جدا کرتے ہوئے (ان میں موجود) ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے۔

﴿السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ﴾ کی ترکیب سے ایک اور مرتبہ ظاہر ہے کہ یہاں بھی کلام سارے آسمانوں اور زمینوں کے پس منظر ہی میں ہورہا ہے۔ اور اس متصل سیاق میں ﴿كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (ہر زندہ چیز) سے مراد کل کائنات کی ساری ہی زندہ اشیاء ٹھہرتی ہیں۔ اس طرح اس اعلان سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر زندہ نوع چاہے وہ نباتات کی قبیل سے ہو یا حیوانات کی، یا خود زمینیں ہی کیوں نہ ہوں سب کو پانی ہی سے پیدا کیا گیا ہے۔

چنانچہ اب ہم اس فلسفۂ خلق وفنا کو اور آگے بڑھاتے ہوئے دیکھیں گے کہ ہماری موجودہ زندہ زمین کا حشر آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہم پر قیامت آنے والی ہے یا حسب سابق اور ساری کائنات میں جاری عام سنت

الٰہی کے موافق اسے پانی کی معدومی کے عمومی عذاب کے ذریعے ایک اور مرتبہ موت کی نیند سلا کر یہاں کی ساری ہی انواع حیات کو ختم کر دیا جائے گا؟ حسب ذیل آیات کریمہ بھی ہمارے موجودہ طرز فکر کو کافی جلا بخشنے والی اور مزید تقویت پہنچانے والی ہیں:

۱۰- ﴿قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا، حَتّٰى إِذَا رَأَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ، فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضْعَفُ جُنْدًا﴾ (مریم.۷۵)

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ جو گمراہی میں مبتلا ہیں رحمٰن بھی انہیں خوب ڈھیل دیئے جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اسے دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، چاہے وہ عذاب ہو یا قیامت، تب معلوم کرلیں گے کہ برے مرتبے اور کمزور لشکر والا کون ہے۔

﴿قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ، إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (انعام:۴۰) ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کہ تم پر چاہے اللہ کا عذاب آئے یا قیامت ہی آجائے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟

ان دونوں آیات میں الفاظ قرآنی سے پوری طرح عیاں ہے کہ خطاب رسولؐ اللہ کے توسط سے عمومی نوعیت ہی کا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں ہی آیات دوٹوک الفاظ میں اعلان کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے جس چیز کا وعدہ فرما رہا ہے وہ قیامت بھی ہو سکتی ہے یا کوئی دوسرا عذاب بھی۔ چنانچہ ہم پر کسی قسم کے عذاب بھیجے جانے کے احتمال کی موجودہ تصریح نہایت اہم اور کافی معنی خیز ہے، کیوں کہ حتمی طور پر اگر ہم پر قیامت ہی واقع ہونے والی ہوتی تو یہاں کسی دوسرے عذاب کے امکان کا ذکر ہی نہایت لغو اور فالتو ہوتا، جس کی توقع ذات باری تعالیٰ سے کسی بھی قیمت پر نہیں کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا کلام الٰہی اس ضمن میں ہماری مزید رہنمائی اس طرح کرتا ہے:

۱۱- ﴿أَفَأَمِنُوْا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ (یوسف:۱۰۷)

ترجمہ: سو کیا یہ اس سے بے فکر ہو چکے ہیں کہ ان پر اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب آپہنچے یا اچانک ان پر قیامت ہی آپڑے، اور انہیں خبر بھی نہ ہو؟

﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ﴾ (حج:۵۵)

ترجمہ: کافر ہمیشہ اس (قرآن) کی طرف سے شک میں مبتلا رہیں گے یہاں تک کہ ان پر آچانک قیامت یا ایک بنجر دن کا عذاب ہی آجائے۔

پچھلے دونوں آیات میں قیامت کے بجائے ہم پر نازل ہونے والے جس عذاب کے احتمال کا ذکر تھا موجودہ دونوں آیات اس کے خدوخال کو مزید واضح کرتے ہوئے اسے کسی حد تک یقینی صورت حال میں تبدیل کرنے والی ہیں۔ لہذا یہاں پہلی آیت میں ﴿غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ﴾ (اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب) کے ذریعے یہ خبر دی جارہی ہے کہ ہم پر کوئی عمومی عذاب ایسا بھی نازل ہوسکتا ہے جو یہاں کے سارے ہی موجودات کو ڈھانک کر اپنی آغوش میں لے لینے والا ہو۔ جب کہ دوسری آیت میں ﴿عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ﴾ (ایک بنجر دن کا عذاب) کے ذریعے اس ممکنہ عذاب کی ایک اور صفت یہ بھی بیان کی جارہی ہے کہ وہ ایک بنجر کردینے والا عذاب ہی ہوگا۔

ملحوظ رہے کہ ان چاروں آیات میں سے ہر آیت کریمہ کے ذریعے عذاب الٰہی ﴿الْعَذَابُ﴾ کو نہایت دو ٹوک الفاظ میں قیامت ﴿السَّاعَةُ﴾ کے بالمقابل پیش کیا گیا ہے، جو کافی معنی خیز ہے۔ اب حسب ذیل آیت کریمہ ملاحظہ ہو، جس کے ذریعے بالکل صریح الفاظ میں خبر دی جارہی ہے کہ ہم پر قیامت کے بجائے یقینی طور پر عذاب ہی نازل ہونے والا ہے:

۱۲- ﴿...إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ﴾ (سبا:۴۶)

ترجمہ: وہ تو تمہیں ایک سخت عذاب کے وقوع سے قبل صرف ایک ڈرانے والے ہیں۔

چنانچہ کتاب اللہ اس فلسفے کو اور زیادہ آگے بڑھاتے ہوئے ان آیات کی مزید توضیح وتشریح اس طرح کرتی ہے:

۱۳- ﴿قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَآءٍ مَّعِينٍ﴾ (ملک:۳۰)

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارا پانی زمین کے خوب اندر دھنس جائے تو تمہارے پاس سطحی سیال پانی کون لے کر آئے گا؟

سابقہ ﴿غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ﴾ (اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب) اور ﴿عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ﴾ (ایک بنجر دن کا عذاب) سے کیا مراد ہوسکتا ہے اس کی تصویر کشی یہاں ایک نہایت دوررس طبیعی حقیقت اور ہمہ گیر فلکیاتی مظہر کے روپ میں کی جارہی ہے۔ لغت کے اعتبار سے ﴿غَوْرًا﴾ "غَارَ، يَغُوْرُ" کا مصدر ہے، جس کے معنے "زمین کے اندر دھنسنا" ہوتے ہیں، اور یہاں اس کا استعمال ﴿مَآءٌ﴾ (پانی) کی صفت کے طور پر ہورہا ہے۔ یاد رہے کہ جب مصدر ہی کو صفت کے طور پر استعمال کردیا جاتا ہے تو معنوی اعتبار سے اس میں "غَائِرٌ" سے بھی زیادہ تاکید پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ "اَلْمَاءُ الْغَوْرُ" کے معنے "زمین کے خوب اندر دھنسنے والا" ہوجاتے ہیں۔ اور ﴿مَآءٌ مَعِينٌ﴾ لغت اور روایت دونوں ہی اعتبارات سے اس پانی کو کہتے ہیں جو آنکھوں کو نظر آئے اور سطح زمین پر جاری بھی ہو:

"ظاهر تراه العين جاريا على وجه الأرض" (تاج العروس)

"ظاهر جار على وجه الأرض" (القاموس المحيط)

"نابع سائح جار علی وجہ الأرض" (تفسیر ابن کثیر)

"الجاری" (تفسیر طبری عن قتادۃ والضحاک)

چنانچہ آج ٹھیک یہی وہ پانی ہے جسے جدید فلکیات کی اصطلاح میں "سطحی سیال پانی" (surface liquid water) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت کریمہ کے ذریعے اسی سورۂ ملک کی سابقہ آیت نمبر ۲۵ میں منکرین کی جانب سے وعدۂ عذاب الٰہی کی تکمیل کے مطالبے: ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ وعدہ کب جا کر پورا ہونے والا ہے؟) کا جواب ایک حیرت انگیز اور انتہائی معنی خیز سوال کے ذریعے دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس جوابی سوال کے مطابق ہمارے اوپر نازل ہونے والے عذاب کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ماضی میں ہماری مردہ زمین کو جس طرح بارش کے پانی سے زندہ کر کے اس میں سارے مظاہر حیات و وجود بخشا گیا تھا اب سطح زمین کا سارا پانی زیر سطح خوب اندر کی جانب دھنسا دیا جائے گا، جس سے وہ عمومی اور کلی طور پر خشک و بنجر میدان میں تبدیل ہو کر اس پر موجودہ سارے انواع حیات (نباتاتی اور حیواناتی دونوں) نیست و نابود ہو جائیں گے! غور کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے لئے ﴿إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا﴾ (اگر تمہارا پانی زمین کے اندر خوب دھنس جائے) کی موجودہ خدائی وعید اور مذکورہ بالا ہم پر نازل ہونے والے ممکنہ عذابات: ﴿غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللَّهِ﴾ (اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب) اور ﴿عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ﴾ (ایک بنجر دن کا عذاب) کی کس قدر درست تفسیر و توجیہ کرنے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہماری زمین کا سارا پانی خوب اندر کی جانب دھنسا دیا جائے تو وہ عذاب اس قدر مہیب اور تباہ کن ہوگا کہ پوری زمین کو ڈھانک کر اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے بنجر اور چٹیل میدان بنا کر رکھ دے گا۔ اب حسب ذیل آیات کریمہ ملاحظہ ہوں، جو ٹھیک یہی وعید بالجزم اور نہایت دوٹوک الفاظ میں پیش کرنے والی ہیں، جس کے بعد اس ضمن میں شک و تردد کی کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا. وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا﴾ (کہف: ۷-۸)

ترجمہ: زمین پر جو کچھ بھی ہے ہم نے اسے اس کی زینت بنایا ہے، تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں اچھا عمل کون کرتا ہے۔ اور اس پر جو کچھ بھی ہے یقیناً ہم اسے بنجر میدان بنانے والے ہیں۔

لہٰذا یہاں بطور عبارۃ النص یہ وعید پیش کی جا رہی ہے کہ ہماری زمین کو آگے چل کر عذاب الٰہی کے ذریعے تباہ و برباد کر کے اسے مردہ اور بنجر و چٹیل میدان بنا دیا جائے گا۔ یعنی زمین اس عذاب الٰہی کے بعد بھی بدستور کی توں برقرار رہے گی، مگر اس کی زینت اور اس کی ظاہری چمک دمک اور اس کی سرسبزی و شادابی اس سے اس طرح چھین لئے جائیں گے اور اس پر موجود تہذیبی و تمدنی آثار اس طور سے ختم کر دئے جائیں گے کہ کل اگر کوئی اس کو دیکھے گا تو اسے

محسوس ہوگا کہ گویا وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی: ﴿فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ﴾ (ہم نے اسے ایسا صاف کر دیا گویا کہ وہ کل آباد ہی نہیں تھی)!

مزید برآں ہمارے پانی کو زمین میں خوب اندر کی جانب دھنسا ہم پر عذاب نازل کئے جانے کی وعید پیش کرنے کے بعد آگے ہم سے اعجازی انداز میں سوال کیا جارہا ہے کہ ہمارے پاس ''سطح زمین پر جاری رہنے والا سیال پانی'' کون لے کر آئے گا۔ غور کیا جاسکتا ہے کہ یہاں اس سوال کو منطقی طور پر اس طرح ہونا چاہئے تھا کہ اگر تمہارا پانی زمین کے خوب اندر دھنس جائے تو دوبارہ ''اسے'' تمہارے پاس کون لے آئے گا: ''قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِهٖ'' ۔ ظاہر ہے کہ جو چیز معدوم ہوجائے مطالبہ بھی عین اسی کی فراہمی کا ہو۔ مگر اس سوال میں نظم کلام سے انحراف کرتے ہوئے ضمیر کے بجائے خود ﴿مَآءٌ﴾ کو دوبارہ دہرا کر اس کی صفت ﴿مَعِيْنٌ﴾ کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں سوال یہ کیا جارہا ہے کہ ہمارا پانی زمین کے خوب اندر دھنس جانے کی صورت میں ہمارے پاس سطح زمین پر جاری رہنے والا سیال پانی کون لے آئے گا۔ یعنی معدومی کسی چیز کی اور فراہمی کا مطالبہ کسی اور ہی کا۔ اب یہ بالکل ہی الگ بات ہے کہ خود ہمارا موجودہ پانی بھی سطح زمین پر جاری رہنے والا سیال نوعیت ہی کا ہے۔

چنانچہ اب اگر اس ارشاد باری پر دوبارہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نظم کلام سے یہ انحراف محض ظاہری نوعیت کا ہے، اور یہ کہ یہاں تعبیر کی اس اعجازی تبدیلی کے ذریعے یہ معنی خیز اشارہ دیا جارہا ہے کہ عذاب کی صورت میں سطح زمین کا سیال پانی زیر زمین خوب دھنس جانے کے بعد سیال نہ رہتے ہوئے کوئی اور شکل وصورت اختیار کر لیتا ہے، جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اس کی ہیئت بدل کر اسے سیال بھی کرنا پڑتا ہے! یہاں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ پانی مادے کی تینوں حالتوں یعنی سیال، منجمد (ٹھوس) اور بخاراتی شکلوں میں موجود رہتا ہے، اور ماحول میں مناسب تبدیلیوں کی بنا پر اپنی ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، جس کا ہم اپنی روزمرہ کی زندگی ہی میں بار بار مشاہدہ کرتے آرہے ہیں۔ چنانچہ اس کا درجہ حرارت اگر کم کر دیا جائے تو وہ منجمد برف ہوجاتا ہے، اور جب اسے گرم کیا جاتا ہے تو اس کا درجہ حرارت بڑھ کر وہ آبی بخارات کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب چاہے منجمد برف اور آبی بخارات کا درجہ حرارت بالترتیب بڑھا اور گھٹا کر ان سے دوبارہ سیال پانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (جاری ہے)

نوٹ :

نائب مہتمم حضرت مولانا انوار الحق حقانی صاحب مدظلہ کسی رؤیت ہلال کمیٹی کے ممبر نہیں ہیں۔

جامعہ کے ترجمان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ نائب مہتمم حضرت مولانا انوار الحق مدظلہ کا کسی بھی رؤیت ہلال کمیٹی سے کسی قسم کا واسطہ اور تعلق نہیں۔ جان بوجھ کر اس متنازعہ مسئلہ میں دارالعلوم کو گھسیٹا جاتا ہے۔ جس موصوف کا نام میڈیا پر لیا جاتا ہے دراصل انکا تعلق کوئٹہ بلوچستان سے ہے۔ (ترجمان: مولانا وصال احمد مدرس وناظم تعلیمات)